اقبال کا تصورِ عشق

زہرا بتول
ریسرچ اسکالر، شعبہ علوم اسلامی، جامعہ کراچی

Abstract:

It is a fact that according to Iqbal's philosphy, Ishq holds a significant position, which can not be neglected under any circumstances. His literary compositions in both Urdu and Persian, point towards the same. Iqbal is of the view that Ishq is God's blessing on mankind. He believes that God has bestowed each of His creations with the spirit of Ishq, pertaining to their ability of expression, however, the human heart has been blessed with greater privilege in this regard, From the day that Universe has been created, everything in nature reflects Ishq in its finest form and it is the spirit of Ishq that is responsible for bringing life to the Universe. It is Ishq that evokes in man the spirit of freedom due to which he feels that he can surmount the greatest of obstacles. Iqbal further believes that Ishq encourages man to realize his true potential and achieve the goals that he sets for himself without questioning whereas

wisdom misleads man. Wisdom raises questions and goes astray in finding the answers, while Ishq achieves its target on the basis of faith.

یہ ایک حقیقت ہے کہ! اقبال کہ نظام فکر وفن میں عشق کو ہمیشہ سے ہی ایک مرکزی حیثیت حاصل رہی ہے، جسے نظر انداز کرنا کچھ اتنا آسان نہیں ہے اس اعتبار سے بجا طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ! ہم اقبال کی فکر ونظر سے زیادہ سے زیادہ اسی وقت استفادہ کر سکتے ہیں، جب ہم ان کے فلسفے کے مطالعے میں ان کی فکری کلیت کو مدنظر رکھیں، جبکہ ان کی فکری کلیت کا مرکز ومحور بھی عشق کے سوا اور کچھ نہیں۔ اقبال کے اردو اور فارسی کلام میں ہمیں جا بجا جذب وجنون، سوز وگداز، مستی اور سرمستی، شوق وجستجو، اور عشق ومحبت کی تکرار نظر آتی ہے جسے اقبال نعمت ازلی اور عطیہ خداوندی سمجھتے ہیں ان کا یہ ماننا ہے کہ یوں تو اس نعمت کو اللہ تعالیٰ نے ساری مخلوق کو ہی حسب ضرورت اور حسب توفیق عطا فرمایا ہے، لیکن انسانوں کو بطور خاص اس نعمت سے سرفراز فرما کر ان کے سینوں کو اس سے منور اور معمور کیا ہے، لہٰذا تخلیق کائنات کی ابتداء سے لے کر اس کے ارتقاء کے ہر مرحلے میں ہمیں جا بجا عشق کی ہی موشگافیاں نظر آتی ہیں بہ الفاظ دیگر کائنات کی تمام رونق ہی عشق کے دم قدم سے ہے۔ بقول ڈاکٹر قاضی عبدالحمید کہ!

'عشق میں عقل کی موشگافیوں اور چوں چرا کی گنجائش نہیں ہے۔ وہ رموز کے سارے پردے اس طرح اٹھا دیتا ہے کہ شاید معنی بے نقاب ہو جاتا ہے، ہر چیز میں معنی پیدا کر لینا اس کی سرشت میں ہے۔ اس انفرادیت پسندی کے باوصف وہ نظام قدرت کو باہم مربوط رکھنے میں مدد دیتا ہے۔ ذرے ذرے کو ایسی تربیت دیتا ہے کہ اس کا معنوی تعلق، اصل حقیقت سے بہر حال قائم رہتا ہے۔ عشق راہ کی دشواریوں اور رکاوٹوں کو خاطر میں نہیں لاتا، کسی خوف وہراس کے بغیر آتش نمرود میں کود پڑتا ہے۔ اور بلا آخر اپنی منزل مقصود کو پالیتا ہے'۔(۱)

بقول اقبال کہ!

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی
عشق فرمودہ قاصد سے سبک گام عمل
عقل سمجھی ہی نہیں پیغام ابھی
پختہ ہوتی ہے اگر مصلحت اندیش ہو عقل

عشق ہو مصلحت اندیش تو ہے خام ابھی (۲)

اس اعتبار سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ عشق کا یہی وہ عملی اور متحرک پہلو ہے جو ہمیں اقبال کہ فلسفہ خودی میں نظر آتا ہے، اکثر مفکرین کی نظر میں عشق انسانی فطرت کا لطیف ترین حسی پہلو ہے، جبکہ بعض اہل علم حضرات عشق ومحبت کو انسانی روح پر الہام ووجدان کی بارش یا معرفت سے بھی تعبیر کرتے ہیں، لیکن جو بھی ہو بہر حال یہ ایک قدیم ترین جذبہ ہے۔ یوں تو 'عشق' عربی زبان کا لفظ ہے، جس کے معنی انتہائی شدید جذباتی تعلق، شدید شوق یا وفور محبت کے ہیں۔ (۳) اور اگر دیکھا جائے تو دنیا بھر کے ادب میں لفظ 'عشق' کو ہمیشہ سے ہی ایک خاص مقام اور اہمیت حاصل رہی ہے، جبکہ دنیا کے تقریباً تمام ہی مکتبہ فکر سے تعلق رکھنے والے افراد چاہے وہ عالم، فقیہہ، صوفی، دانش وریا پھر عام انسان ہی کیوں نہ ہوں ہر کسی نے اپنے انداز سے نا صرف عشق کی تعریف پیش کی ہے بلکہ اس کے اسباب ومظاہر اور درجات پر بھی تفصیلی بحث کی کوشش کی ہے۔ جیسا کہ میر تقی میر نے اپنی خودنوشت میں لکھا ہے کہ میرے والد اور چچا دونوں عشق حقیقی کے رموز سے آشنا تھے اور اس وقت میری عمر بہ مشکل آٹھ یا نو سال کی تھی اور یہ دونوں احباب مجھے یہ ہدایت فرمایا کرتے تھے کہ!

'بیٹا عشق اختیار کرو، عشق ہی اس کارخانے پر مسلط ہے۔ اگر عشق نہ ہوتا تو یہ سارا نظام درہم برہم ہو جاتا بے عشق زندگانی وبال ہے اور عشق میں دل کھونا اصل کمال ہے۔ عشق ہی بناتا ہے اور عشق ہی بگاڑتا ہے۔ عالم میں جو کچھ ہے عشق کا ظہور ہے۔ آگ سوز عشق ہے، پانی رفتار عشق ہے، خاک قرار عشق ہے، ہوا اضطرار عشق ہے۔ موت عشق کی مستی ہے، حیات عشق کی ہوشیاری ہے، رات عشق کا خواب ہے، دن عشق کی بیداری ہے'۔ (۴)

اس اعتبار سے اگر اپنے اطراف کا جائزہ لیا جائے تو ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہمارے یہاں ایک بہت بڑا طبقہ جس میں صوفیاء، شعراء اور متصوفین شامل ہیں وہ نظریہ وحدت الوجود کے قائل ہیں جس کی رو سے کائنات میں صرف اور صرف خدا کی ذات کا وجود ہے اور اس کے سوا کچھ نہیں ہر روح خدا سے جدا ہو کر پہلے اس دنیا یعنی اسفل سافلین میں آتی ہے لیکن پھر بلا آخر اپنی اصل کی طرف عود کرتی ہے اور اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ کائنات اپنا ارتقائی سفر اسی لئے مرحلہ وار طے کر رہی ہے کیونکہ اسے خدا سے وصال کامل کی طلب اور جستجو ہے۔ صوفیاء کے نزدیک ذات خداوندی میں اپنی ذات کو فنا کر کے بقا حاصل کر لینا افضل ترین مقام اور کیفیت ہے جو جنت اور اس کی اعلیٰ ترین نعمتوں سے بھی ارفع ہے۔ گو کہ اس نظریے کو مسلمانوں میں بے حد پسند کیا گیا اور اسے پذیرائی ملی، لیکن اقبال اس نظریے کو شدت سے مسترد کرتے ہوئے نظریہ وحدت الشہود کی بات کرتے ہیں ان کا یہ ماننا ہے کہ کائنات میں موجود ہر شے اپنا ایک علیحدہ تشخص اور وجود رکھتی ہے اور عشق کا ہرگز بھی یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ اپنی ذات اور تشخص کو فنا کر دے بلکہ ہر صورت میں اس کی انفرادیت کا قائم رہنا

از حد ضروری ہے۔ اور یہی وجہ تھی کہ اقبال کی دور اندیشی، ملت اسلامیہ کے زوال کے اصل سبب کو بہت جلد جان گئی وہ اس حقیقت کو پا گئے کہ ملت اسلامیہ روحانی تعیشات، کاہلی اور بے عملی کا بری طرح سے شکار ہو چکی ہے جس کا اصل سبب ان میں نظریہ وحدت الوجود کے عقیدے کا جڑ پکڑ لینا ہے جو کہ سراسر ایک غیر اسلامی نظریہ ہے جس نے مسلمانوں کو نا صرف شدت سے متاثر کیا ہے بلکہ انھیں قوت عمل اور خوداری سے بھی محروم کر دیا ہے آپ اپنے ایک مکتوب بنام سراج الدین پال، بتاریخ ۱۰ جولائی ۱۹۱۶ء میں لکھتے ہیں کہ!

'افسوس ہے مسلمان مردہ ہیں۔ انحطاط ملی نے ان کے تمام قویٰ کو شل کر دیا ہے اور انحطاط کا سب سے بڑا جادو یہ ہے کہ یہ اپنے صید پر ایسا اثر ڈالتا ہے کہ جس سے انحطاط کا مسحور اپنے قاتل کو اپنا مربی تصور کرنے لگ جاتا ہے، یہی حال اس وقت مسلمانوں کا ہے۔۔ شعرائے عجم میں بیشتر وہ شعراء ہیں جو اپنے فطری میلان کے باعث وجودی فلسفے کی طرف مائل تھے۔ اسلام سے پہلے بھی ایرانی قوم میں یہ میلان طبیعت موجود تھا، اور اگر چہ اسلام نے کچھ عرصے تک اس کا نشو نما نہ ہونے دیا، تاہم وقت پا کر ایران کا طبعی مذاق اچھی طرح سے ظاہر ہوا، یا با الفاظ دیگر مسلمانوں میں ایک ایسے لٹریچر کی بنیاد پڑی جس کی بنا وحدت الوجود تھی۔ ان شعراء نے نہایت عجیب وغریب اور بظاہر دلفریب طریقوں سے شعائر اسلام کی تردید و تنسیخ کی اور اسلام کی ہر محمود شے کو ایک طرح سے مذموم بیان کیا ہے۔ اگر اسلام افلاس کو برا کہتا ہے تو حکیم سنائی افلاس کو اعلیٰ درجہ کی سعادت قرار دیتا ہے۔ اسلام جہاد فی سبیل اللہ کو حیات کے لئے ضروری تصور کرتا ہے تو شعراء عجم اس شعار اسلام میں کوئی اور معنی تلاش کرتے ہیں، مثلاً:

غازی زپے شہادت اندر تگ و پوس
غافل کہ شہید عشق فاضل تراز دست
در روز قیامت ایں باد کے ماند
ایں کشتہ دشمن است وآں کشتہ دوست

یہ رباعی شاعرانہ اعتبار سے نہایت عمدہ ہے اور قابل تعریف، مگر انصاف سے دیکھئے تو جہاد اسلامیہ کی تردید میں اس سے زیادہ دلفریب اور خوبصورت طریق اختیار نہیں کیا جا سکتا۔ شاعر نے کمال یہ کیا ہے کہ جس کو اس نے زہر دیا ہے، اس کو احساس بھی اس امر کا نہیں ہو سکتا کہ مجھے کسی نے زہر دیا ہے، بلکہ وہ یہ سمجھتا ہے کہ مجھے آب حیات پلایا گیا ہے۔ آہ! مسلمان کئی صدی سے یہی سمجھ رہے ہیں'۔ (۵)

اقبال کا یہ ماننا ہے کہ اگر عشق نفسانی خواہشات سے مبرا ہو تو پھر وہ ایک اعلیٰ ترین عبادت ہے کیونکہ عشق کی تجلیات میں یکسانیت نہیں پائی جاتی ہے اور یہ ہر شخص کو اس کی قوت استعداد کے مطابق عطا کی جاتی ہے لہٰذا ہر انسان کا تجربہ اور کیفیات بھی دوسروں سے مختلف ہوتی ہیں۔ بقول ڈاکٹر یوسف خان کہ! اقبال کا تصور عشق، دوسرے شعراء کے متصوفیانہ یا رسمی عشق سے بالکل مختلف ہے۔ عشق ان کے یہاں زندگی کا ایک زبردست محرک عمل ہے جو ایک طرف تسخیر فطرت میں انسان کی مدد کرتا ہے دوسری طرف اسے کائنات کے ساتھ متحد رکھتا ہے۔ عشق سے فرد کی نظر میں اتنی بلندی اور قوت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ ہمت مردانہ کے سامنے جبریل کو 'صید زبوں' خیال کرنے لگتا ہے اور وجدان کی کمند سے ذات ایزدی پر قابو پانے کے منصوبے بناتا ہے'۔(۶)

بقول اقبال کہ!

جمال عشق و مستی نے نوازی!
جلال عشق و مستی بے نیازی
کمال عشق و مستی ظرف حیدر
زوال عشق و مستی حرف رازی (۷)

یہ ایک حقیقت ہے کہ اقبال کے فکر وفن پر تصور ارتقاء کی بڑی واضح اور گہری چھاپ لگی ہوئی ہے، لہٰذا ان کے تمام ہی تصورات ہمیشہ سے اسی تصور ارتقاء کی زد میں رہتے ہیں چاہے ان کا تعلق تصور خودی و بے خودی سے ہو یا پھر تصور عشق سے ان کا یہ ماننا ہے کہ عشق کی بیداری سے لے کر استحکام اور اس کی پختگی میں ارتقاء کے تصور کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے کیونکہ ارتقاء زندگی کا دوسرا نام ہے اور عشق میں ترقی کے منازل کو طے کرنے میں یہ ایک اہم کردار ادا کرتا ہے۔ جیسا کہ اقبال ایک جگہ لکھتے ہیں کہ!

تیرے عشق کی انتہا چاہتا ہوں
میری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں
ستم ہو کہ ہو وعدہ بے حجابی
کوئی بات صبر آزما چاہتا ہوں
یہ جنت مبارک رہے زاہدوں کو
کہ میں آپ کا سامنا چاہتا ہوں
ذرا سا تو دل ہوں، مگر شوخ اتنا

وہی لن ترانی سنا چاہتا ہوں
کوئی دم کا مہماں ہوں اے اہل محفل
چراغ سحر ہوں، بجھا چاہتا ہوں
بھری بزم میں راز کی بات کہہ دی
بڑا بے ادب ہوں سزا چاہتا ہوں (۸)

اگر دیکھا جائے تو قدرت کے اندر ایک قانون تسلسل موجود ہے جس کے سبب نا صرف ہر شے مسلسل تغیر و تبدل کے عمل سے ہمہ وقت گذر رہی ہے بلکہ نہایت کامیابی سے اپنا ارتقائی سفر بھی طے کر رہی ہے پھر یہ بھی ایک کائناتی حقیقت ہے کہ یہاں کوئی شے اچانک وجود میں نہیں آتی ہے، بلکہ اس کی ایک مکمل اور منضبط حیاتیاتی تاریخ بھی ہوتی ہے اور اگر عشق کے حوالے سے یہ کہا جائے کہ یہ بھی اپنے اندر ایک مکمل حیاتیاتی تاریخ لئے ہوئے ہے تو یہ بے جا نہ ہوگا۔ اس حوالے سے تفسیر ابن کثیر کی ایک روایت میں رسول اللہ ﷺ کا ایک ارشاد کچھ اس طرح سے بیان کیا گیا ہے کہ!

'عالم ارواح میں موجود دیگر ارواح کے درمیان بھی موافقت یا منافقت موجود تھی جو روحیں عالم ارواح میں ایک دوسرے سے محبت کیا کرتی تھیں وہ دنیا میں آنے کے بعد بھی اسی طرح محبت کرتی ہیں، اور جو ارواح وہاں ایک دوسرے سے نفرت کیا کرتی تھیں ان کی نفرت دنیا میں بھی بدستور قائم ہے'۔(۹)

اس اعتبار سے اگر اقبال کے فلسفہ عشق کا تجزیہ کیا جائے تو ہم بجا طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان کے یہاں موجود تصور عشق میں جاہ و جلال رعب و دبدبہ اور طنطنہ و ہمہمہ پایا جاتا ہے جس سے مدمقابل متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا ہے، ان کے تصور عشق میں تر و تازگی اور توانائی کا شدید احساس موجود ہے، اقبال کے تصور عشق کی توانائی سے انسان میں خود شناسی کا جذبہ بیدار ہوتا ہے جو اپنی ارفع شکل میں خدا شناسی کے رموز سے بھی آشنائی حاصل کر لیتا ہے، ایسا انسان تسخیر کائنات کے فارمولے سے بھی اسی عشق کے سبب آگاہی حاصل کرتا ہے جس کے لئے زمین پر رہتے ہوئے کائنات کی سیر کچھ مشکل نہیں، عشق کی نگاہ پتھر میں بھی شگاف ڈال دیتی ہے، اس کے لئے چاند کو دو ٹکڑوں میں تقسیم کرنا کچھ مشکل نہیں، یہ وہی عشق ہے کہ جس کی ٹھوکر سے صحرا و دریا دو نیم ہو جاتے ہیں، اسی عشق کی بدولت حیدر کرار نے خیبر فتح کر لیا خالد بن ولید نے بڑی کامیابی سے جانگسل معرکے سر کر لئے، امام عالی مقام نے حق کی سربلندی کی خاطر اپنی اور اپنے اہل بیت کی گردنیں کٹوا دیئیں، طارق بن زیاد نے دشمن کے نرغے میں پہنچ کر اپنی ساری کشتیاں جلا ڈالیں، اسلام کے بے تیغ سپاہیوں نے بحر ظلمات میں گھوڑے دوڑا دیئے، اور یہ وہی عشق تو ہے جو اسلام کے سچے جانثاروں میں عین گھمسان کی لڑائی کے وقت سجدہ

حضوری کی تڑپ بیدار کرتا ہے۔ الغرض دنیا کا ہر بڑا کام معرکہ عشق کا ہی مرہون منت ہے اور اقبال کا تصور عشق تو جوش عمل کے ساتھ وابستہ ہے جو انسان میں ہمت و حوصلہ بیدار کرتا ہے۔

جب عشق سکھاتا ہے آداب خود آگاہی
کھلتے ہیں غلاموں پر اسرار شہنشاہی
عطار ہو، رومی ہو، رازی ہو، غزالی ہو
کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہ سحر گاہی
آئین جواں مرداں حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں رو باہی (۱۰)

اقبال یہ سمجھتے ہیں کہ انسان کی خودی میں عشق کی وجہ سے استحکام اور مضبوطی پیدا ہوتی ہے جو ترقی کرتے کرتے انسان میں جذب و یقین کا احساس پیدا کرتا ہے جس کے باعث انسان با آسانی نظام عالم کی ظاہری و باطنی قوتوں کو مسخر کر لیتا ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر وزیر آغا کہتے ہیں کہ! 'اصل بات یہ ہے کہ اقبال کے یہاں عشق ذوق تسخیر کا نام ہے'(۱۱)

عشق کی بدولت ہی خودی کے پوشیدہ جوہر کھلتے ہیں اور اس کی صلاحیتوں کو نمو پانے کا موقع ملتا ہے اور اس کو سوز درد اور نورانیت حاصل ہوتی ہے جس کی وجہ سے نا صرف خودی میں نکھار پیدا ہوتا ہے بلکہ اطراف و اکناف بھی اس کی ضیاء پاشیوں سے منور ہو جاتے ہیں۔ اقبال کا یہ ماننا ہے کہ عشق خودی کی تربیت میں نہ صرف اہم کردار ادا کرتی ہے بلکہ اس کو مستحکم و مضبوط اور استوار بھی کرتی ہے کیونکہ یقین محکم عشق کی خصوصیت ہے یا بہ الفاظ دیگر یقین کا محکم ترین وسیلہ عشق ہے اور اسی یقین کے بل پر عشق ہر کڑی مشکل کا مردانہ وار مقابلہ کر لیتا ہے۔

مرد خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ
عشق ہے اصل حیات، موت ہے اس پر حرام
تند و سبک سیر ہے گرچہ زمانے کی رو
عشق خود اک سیل ہے، سیل کو لیتا ہے تھام
عشق کی تقویم میں عصر رواں کے سوا
اور زمانے بھی ہیں جن کا نہیں کوئی نام
عشق دم جبرائیل، عشق دل مصطفیٰ

عشق خدا کا رسول، عشق خدا کا کلام
عشق مضراب سے نغمۂ تار حیات
عشق سے نور حیات، عشق سے نار حیات (۱۲)

عشق کی یہ صفت ہے کہ وہ دنیا کے ہر خوف وخطر اور نتائج سے بے پرواہ و بے نیاز ہو کر صرف اور صرف اپنے ہدف کی جانب نہایت یکسوئی سے بڑھتے ہوئے بلا آخر اسے حاصل کر ہی لیتا ہے، جبھی تو خلیفہ عبدالحکیم لکھتے ہیں کہ!

'عشق ہی خلاق اور فعال ہے، محض عقل کی کیفیت انفعالی ہے۔ انسانی ارتقاء میں جو قدم بھی اٹھتا ہے، وہ جذبہ عشق کی ہی بدولت اٹھتا ہے'۔۱۳ یہ عشق ہی تو ہے کہ جس کی بدولت انسان کے قلب ونظر میں وسعت پیدا ہوتی ہے اور وہ شکوک وشبہات سے بالاتر ہو کر سوچتا ہے اور پھر جیسے جیسے وہ عشق کا ارتقائی سفر طے کرتا چلا جاتا ہے نا صرف اس کے عزائم بلند ہوتے ہیں بلکہ اس کی خودی بھی مرحلہ وار ترقی کرتے ہوئے اعلیٰ مدارج طے کرتی چلی جاتی ہے یہ ایک ناختم ہونے والا سفر ہے جو انسان کو ہر لمحہ ایک نئے جہان سے متعارف کرواتا ہے، عشق کے دم قدم سے ہی کائنات قدرت میں رونق، حسن اور خوبصورتی ہے۔ اقبال یہ سمجھتے ہیں کہ عشق زندگی کا جوہر ہے جبکہ خودی عشق کا جوہر ہے، یہی نہیں بلکہ عشق میں کیونکہ حرکی قوت بھی مضمر ہے جو انسان کو ہر لمحہ حیات وکائنات کی نئی تفاسیر سے بھی ہم آہنگ کرتی ہے اور پھر یہی خاکی وجود جب عشق کے آداب سے واقف ہو جاتا ہے تو پھر اسی آگاہی کی بدولت وہ خود شناسی سے خدا شناسی کے مراحل کو بھی بہ احسن وخوبی طے کرتا چلا جاتا ہے۔ اقبال تصور عشق کے حوالے سے نکلسن کے نام اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں کہ!

'یہ لفظ 'عشق' بہت وسیع معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ یعنی کسی شے کو اپنے اندر جذب کر لینے اور جزو بنا کر اپنا لینے کی آرزو کا نام عشق ہے، جس کا کمال یہ ہے کہ تخیل پیدا کرے۔ قدر ومرتبہ پہچانے اور ساتھ ہی ادراک کامل سے اسے بروئے کار بھی لائے حقیقت میں عشق کا کام یہ ہے کہ عاشق ومعشوق کو متمیز کر کے اپنی اپنی جگہ انفرادی شخصیت اور اہمیت بخش دے'(۱۴)

اگر اس عبارت کا تجزیہ کیا جائے تو ہم دیکھتے ہیں کہ اقبال عشق کو ایک انجذابی قوت تسلیم کرتے ہیں جس کی سرشت میں بے قراری اور بے تابی موجود ہے، اور تمام تر نامساعد حالات کے باوجود وہ اپنے ہدف کی جانب نہایت یکسوئی سے بڑھتا ہی رہتا ہے تا آنکہ اسے حاصل نہ کر لے پھر اس ہدف کو پا لینا ہی کافی نہیں ہوتا ہے بلکہ عشق اس ہدف کو اپنے اندر

جذب کرنے کی بھی زبردست خواہش رکھتا ہے۔اس خیال کو خلیفہ عبدالحکیم اس طرح پیش کرتے ہیں کہ!

'عشق کا اگر یہ تجاذب نہ ہوتا تو جہان ٹھٹھر کر رہ جاتا ،اس میں نہ کوئی حرکت ہوتی اور نہ نو بہ نو آفرینش'۔(۱۵)

لہٰذا ہم بجاطور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ اقبال کا تصورِعشق اپنی اثر اندازی اور نتائج کے اعتبار سے قدیم وجدید شعراء کے تصورِعشق سے قطعاً مختلف ہے،اقبال فنافی الشیخ اور طالب کو مطلوب میں گم کردینے کے نظریے کی سختی سے مخالفت کرتے ہیں۔ان کے نزدیک محبوب ومطلوب کا دیدار،قرب اور وصال تو اہم ہے لیکن اس میں فاصلہ ضرور ہونا چاہئے۔اقبال کے اس نظریے کو ڈاکٹر سید عابد حسین نے اس طرح سے واضح کیا ہے کہ!

'عشق کی تین منزلیں ہوتی ہیں۔آرزو یا جستجو ،دیدار اور وصل۔قدیم صوفی شعراء کے یہاں اس تیسری منزل کا مقصود یہ ہے کہ طالب مطلوب کے اندر اس طرح فنا ہوجائے کہ جیسے قطرہ دریا میں محو ہوجاتا ہے اور ظاہر ہے محدود دیا محدود کے وصل کا اس کے سوا کوئی تصور بھی نہیں ہوسکتا،مگر اقبال کے نزدیک اس عشق کی صرف دو ہی منزلیں ہیں۔پہلی منزل سوز وگداز کی ہے،دوسری کیف دیدار کی۔جو راحت بخش بھی ہے اور اضطراب افزا بھی ،تیسری کوئی منزل نہیں۔لذت دیدار سے کامیاب ہونے کے بعد بھی نفس انسانی روح مطلق سے جدا رہتا ہے اور درد جدائی سے تڑپتا ہے یہی اس کی فطرت ہے اور یہی اس کی تقدیر'(۱۶)

لہٰذا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اقبال کے یہاں عشق کے باب میں یہی وہ نقطہ نظر اور عقیدہ ہے جو کہ منفرد نوعیت کا ہے ،وہ محبوب سے ملنے کی شدید تڑپ رکھتے ہیں لیکن اس کے باوجود وصال کے مقابلے میں فراق کو ترجیح دیتے ہیں۔

عالم سوز و ساز میں وصل سے بڑھ کر ہے فراق
وصل میں مرگ آرزو، ہجر میں لذت طلب (۱۷)

اگر اقبال کے تصورِعشق کا تجزیہ کیا جائے تو ہم یہ دیکھتے ہیں کہ وہ عقل کے مقابلے میں عشق کو ترجیح دیتے ہیں لیکن جہاں بات مادی ترقی کی ہو تو وہ علم وعقل کو اہم جانتے ہیں جبکہ روحانی ترقی کے لئے ان کا یہ ماننا ہے کہ یہ سفر تنہا عقل یا علم کے زور پر طے نہیں کیا جاسکتا ہے بلکہ اس کے لئے لازماً عشق کو اپنا رہبر ماننا ہی پڑے گا۔ان کا یہ خیال ہے کہ عشق یا جنون بھی دراصل عقل کی ہی ایک ترقی یافتہ شکل ہے،اور عقل وعشق دونوں ہی زندگی کے رہبر اور منزل آشنا ہیں لیکن ان دونوں میں ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ جس کام کو کرنے کے لئے عقل بہانے تلاش کرتی ہے عشق اسے آن واحد میں کر گذرتا ہے۔

عشق کی لذت مگر خطروں کی جانکاہی میں ہے (۱۸)

لیکن یہ عشق کا ہی کمال ہے کہ وہ اپنی قوت اور سچائی سے انسان کو حقیقت شناس بنا دیتی ہے اور اس کے سامنے کائناتی حقائق ایک ایک کر کے بے حجاب ہونا شروع ہو جاتے ہیں جبکہ عقل اس کے برعکس چوں چراں، حجت اور کٹ بحثی میں ہی مبتلا رہتی ہے۔

عشق تمام مصطفیٰ، عقل تمام ابولہب (۱۹)

بات صرف یہ ہے کہ اقبال کی نظر میں علم کی صرف دو اقسام ہیں۔ ۱۔ علم رحمانی۔ ۲۔ علم شیطانی۔ اگر علم و عقل باطنی شعور سے آگاہی حاصل نہ کرے تو پھر ایسا علم، علم شیطانی بن جاتا ہے جبکہ اس کے برعکس اگر علم و عقل باطنی شعور اور روحانی حقائق سے آشنا ہوں تو ایسا علم، علم رحمانی یا دانش برہانی کہلاتا ہے اور ایسے ہی علم کے سہارے انسان راستے کی بے شمار کٹھنائیاں عبور کرتے ہوئے بلا آخر منزل مقصود تک پہنچ ہی جاتا ہے، یہ وہی علم ہے جو انسان کو اسفل سے نکال کر مقام ارفع تک لے جاتا ہے درحقیقت دانش برہانی کو ہی عشق کہا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اقبال کا تصور عشق اپنے اندر گہری معنویت لئے ہوئے ہے جس کا مقابلہ اقبال کے معاصرین و متاخرین شعراء نہیں کر سکتے ہیں، کیونکہ ان کے کلام میں ہیجان انگیزی، حواس باختگی اور آمادگی فنا کے شدید جذبات پائے جاتے ہیں جبکہ اقبال کے یہاں عشق حرکت، عمل، جدوجہد، حریت، عزم و آرزو اور جذبہ عمل سے آراستہ ہے جو انسان کو اسفل سے نکال کر ارفع تک پہنچانے کی مکمل صلاحیت رکھتا ہے۔

عشق کی ابتداء عجب، عشق کی انتہا عجب (۲۰)

حوالہ کتب

۱۔ اردو اقبال نمبر، مرتب انجمن ترقی اردو دہلی ۱۹۳۸ء، ص ۳۱۰

۲۔ علامہ اقبال، بانگ درا، خزینہ علم وادب لاہور، ۲۰۰۶ء، ص ۳۲۷

۳۔ سید قاسم محمود، اسلامی انسائیکلو پیڈیا (جلد دوم)، ناشران الفیصل، سن ندارد، ص ۱۱۶۷

۴۔ مولوی عبدالحق، ذکر میر، مطبوعہ انجمن ترقی اردو اورنگ آباد ۱۹۲۸ء، ص ۹

۵۔ علامہ اقبال، مرتب شیخ عطا اللہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، اقبال نامہ مجموعہ مکاتب اقبال، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۲۰۰۵ء، ص ۹۰

۶۔ ڈاکٹر یوسف حسین خان، روح اقبال، اعظم اسٹیم پریس حیدر آباد دکن ۱۹۴۱ء، ص ۳۷

۷۔ علامہ اقبال، بال جبرئیل، خزینہ علم وادب الکریم مارکیٹ اردو بازار لاہور ۲۰۰۶ء، ص ۴۲۷

۸۔ ایضاً ص ۴۳۲

۹۔ شیخ الحفاظ والمحد ثین عماد الدین ابی الفداء اسماعیل بن عمر بن کثیر بن ضوء بن کثیر القرشی الدمشقی الشافعی تفسیر ابن کثیر القرشی، مطبع الفجالہ الجدیدۃ القاہرہ، ۱۹۶۸ء

۱۰۔ علامہ اقبال، بال جبرئیل، ص ۴۰۲

۱۱۔ ڈاکٹر وزیر آغا، تصورات عشق وخرد، اقبال اکادمی پاکستان لاہور ۱۹۷۷ء، ص ۲۵

۱۲۔ بال جبرئیل، ص ۴۳۹

۱۳۔ خلیفہ عبدالحکیم، فکر اقبال، بزم اقبال لاہور ۱۹۸۶ء، ص ۳۱۰

۱۴۔ شیخ اکبر علی، اقبال، اس کی شاعری اور پیغام، کمال پبلیشرز لاہور ۱۹۴۶ء، ص ۲۱۸

۱۵۔ خلیفہ عبدالحکیم، حکمت رومی، مطبوعات ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور ۱۹۵۵ء، ص ۳۱

۱۶۔ اردو (اقبال نمبر طبع جدید) انجمن ترقی اردو دہلی ۱۹۴۰ء، ص ۴۵

۱۷۔ بال جبرئیل، ص ۴۵۷

۱۸۔ بانگ درا، ص ۲۰۱

۱۹۔ بال جبرئیل، ص ۴۵۷

۲۰۔ بال جبرئیل، ص ۴۵۷